عروسِ ادب

(جلد اوّل)

انتخابِ کلام
حضرت جوش ملیح آبادی

مرتّبہ :- عین الحق

PK
2199
J6
A89
1983
V.1

بارِ اوّل	فروری ۱۹۸۳ء
تعداد	پانچ سو جلدیں
اشاعت	بزمِ جوش کراچی
کتبہ	آصف اقبال غزنوی
مطبع	ماس پرنٹرز ۲، رڈی کمرشل ایریا، ناظم آباد ۵ کراچی ۱۸
قیمت	۴۵ روپے ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ	۱۵/۱۵۰۵ فیڈرل بی ایریا، کراچی ۳۸

عروسِ ادب کی ترتیب کے جملہ حقوق محفوظ ہیں!

UNIVERSITY
OF
PENNSYLVANIA
LIBRARIES

خاندان	آفر…
سگڑ دادا	محمد…
پڑدادا	فقیر…
دادا	محمد…
والد	بشیر…
پیدائش	صبح…
پہلا نام	شبیر…
تخلص	جوش…
نام تبدیل کیا، ۱۹۰۷ء	شبیر…
قد	۵ فٹ…
بھائی	شفیع…
بہنیں	افسر…
نکاح	۱۹۰۷…
بیوی	اش…
وداع	۱۹۱۶ء…
بیٹی	سعید…
بیٹا	سجاد…
اساتذہ	مرزا ہادی…

۱۹۲۸ء

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا ؟

یہ کون اٹھا ہے شرماتا　رین کا جاگا نیند کا ماتا
نیند کا ماتا ، دھوم مچاتا　انگڑائیاں لیتا ، بل کھاتا
یہ کون اٹھا ہے شرماتا ؟

رُخ پہ سرخی ، آنکھ میں جادو　بھینی بھینی بر میں خوشبُو
بانکی چتون ، سمٹے ابرو　نیچی نظریں بکھرے گیسُو
یہ کون اٹھا ہے شرماتا ؟

نیند کی لہریں گنگا جمنی　جلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل ڈھلکا ، مسکی ساری　ہلکی مہندی ، دُھندلی بیندی
یہ کون اٹھا ہے شرماتا ؟

ڈوبا ہوا رُخ ، تابانی میں　انوارِ سحر پیشانی میں
یا آبِ گہر طغیانی میں　یا چاند کا مکھڑا پانی میں
یہ کون اٹھا ہے شرماتا ؟

رخسار پہ موجِ رنگینی !　کچّی چاندی ، سچّی چینی
آنکھوں میں نقوشِ خود بینی　مکھڑے پہ سحر کی شیرینی
یہ کون اٹھا ہے شرماتا ؟

آنکھ میں غلطاں عشرت گاہیں　نیند کی سانسیں جیسے آہیں
بکھری زلفیں عریاں باہیں　جان سے ماریں جس کو چاہیں

۱۹۲۹ء

یہ کون اٹھا ہے شرماتا؟

پھیلا پھیلا آنکھ میں کاجل الجھا الجھا زُلف کا بادل
نازک گردن، پھول سی ہیکل سُرخ پپوٹے نیند سے بوجھل

یہ کون اٹھا ہے شرماتا؟

کچھ جاگ رہی، کچھ سوتی ہے ہر موجِ صبا منہ دھوتی ہے
ناشُستہ رُخ یا موتی ہے انگڑائی سے جز بز ہوتی ہے

یہ کون اٹھا ہے شرماتا؟

چہرہ پھیکا نیند کے مارے پھیکے پن میں شہد کے دھارے
جو بھی دیکھے جان کو وارے دھرتی ماتا بوجھ سہارے

یہ کون اٹھا ہے شرماتا؟

ہلچل میں دل کی بستی ہے طوفانِ جنوں میں ہستی ہے
آنکھ میں شب کی مستی ہے اور مستی دل کو ڈستی ہے

یہ کون اٹھا ہے شرماتا؟

فکر و نشاط

۱۹۲۹ء

جوانی کا بسترِ مرگ

سبق عبرت کا لے ناداں! بالوں کی سفیدی سے کفن اوڑھا ہے جیتے جی اُنگارِ زندگانی نے
نظر کر جھریوں سے شیب کے سمٹے ہوئے رُخ پر یہ وہ بستر ہے دم توڑا ہے جس پر نوجوانی نے

البیلی صبح

نظر جھکائے عروسِ فطرت، جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں، افق کی لَو تھرتھرا رہی ہے

رَوِش رَوِش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشنِ رنگ و بُو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزلخواں، کلی کلی گنگنا رہی ہے

ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگارِ مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے

طیورِ بزمِ سحر کے مطرب لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیمِ فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے

کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں یہ ہیرے کی کیل پہنے، کوئی پری مسکرا رہی ہے

سحر کو مدِ نظر ہیں کتنی رعایتیں چشمِ خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی، لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے

شلوکا پہنے ہوئے گلابی، ہر اک سُبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا ہوا میں پلّو سکھا رہی ہے

فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گردِ پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی، جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے

کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیو! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رَو میں، یہ کس کی آواز آ رہی ہے

سماعت آغوش سوز میں ہے نگاہ دامن میں بجلیوں کے
ہر ایک ذرّہ غزل سرا ہے ہر ایک شئے جگمگا رہی ہے
ضرور کوئی دراز مژگاں ہٹا رہا ہے نقاب رُخ سے
فضول تاروں میں ہے تلاطم یہ شمع یوں جھلملا رہی ہے
جڑا ہوا ہے بلندیوں پر فلک کی باریک آئینہ سا
اس آئینے میں عروسِ تخیل اپنے گیسو بنا رہی ہے
ضرور آئینہ دیکھنے میں ترے لبوں پر تھا کچھ تبسّم
جھکا نہ شرما کے یوں نگاہیں تری نظر مسکرا رہی ہے
غضب کی بدمست دل ربا ہے یہ جوشِ نوخیز بھولی بھالی
چمن میں سرخ انکھڑیوں کو ملتی ہتھیلیوں سے جو آ رہی ہے

۱۹۲۵ء

کلیوں کی بیداری

شعلہ و شبنم

ہر اک کلی، پھول بن رہی ہے، ہر ایک خوشہ جھلک رہا ہے
مچل رہی ہے نسیم بُستاں، تمام صحرا مہک رہا ہے
کلاہِ نو کج کیے ہوئے ہے ہلال، تاروں کی انجمن میں
کھلا ہوا ہے فلک کا سینہ، زمیں کا غنچہ چٹک رہا ہے
ٹپک رہی ہے گلوں سے شبنم، لچک رہی ہیں ادا سے شاخیں
ہر اک کلی تال دے رہی ہے، ہر ایک طائر چہک رہا ہے
لپیٹے منہ، سو رہی تھیں کلیاں، صبا نے آ کر جو گدگدایا
سرک گئے ہیں سروں سے آنچل، تمام گلشن مہک رہا ہے

۱۹۲۵ء

ابر کے ٹکڑ
خشک چٹیل
ہر طرف اک
جا بجا اجڑ
خون تھا جو
گاؤں کے شیشہ
ہو چکی ہیں خ
اب بھی غلط
گیت کھیتوں
جذب ہے اس
کتنی تانوں
دختران دشت
اس فضا میں

گذرتی ہیں جو اد خود
نہیں معلوم کیا کیا د

پیغمبرِ فطرت

تاروں نے جھلملا کے جو چھیڑا ستارِ صبح
گانے لگی چمن میں نسیمِ بہارِ صبح

غنچوں کی چشمِ ناز سے ٹپکا خمارِ صبح
ابھرا افق سے جامِ زمرّد نگارِ صبح

شاعر کی رُوح، عشق کی ہمراز ہو گئی
دنیا تمام جلوہ گہہ ناز ہو گئی

شمعیں ہوئیں خموش، چہکنے لگے طیور
الٹی نقاب چرخ نے، جھلکا زمیں پہ طور

سینوں میں اہلِ دل کے ہوئے قلب چور چور
آنکھوں سے رخ پہ دوڑ گیا آنسوؤں کا نور

دریا بہے، چٹک گئیں کلیاں گلاب کی
پھوٹی کچھ اس ادا سے کرن آفتاب کی

سبزے پہ لہر آئی، جنوں خیز ہو گیا
جھونکا ہر اک نسیم کا گل ریز ہو گیا

شب کا سکوت لحنِ دل آویز ہو گیا
رنگِ حیات ولولہ انگیز ہو گیا

تنویر خندہ زن ہوئی تاریک رات پر
حسنِ ازل کی چھوٹ پڑی کائنات پر

بادِ سحر کے جام پہ قرباں ہزار جم
دامن تمام شبنمِ تازہ سے جس کا نم

جھونکے نہیں یہ چرخ سے ہے بارشِ کرم
ہر سانس غسل دیتی ہے سینے کو دم بدم

تھی روح میں جو شب کی کثافت وہ دُھل گئی
گہری جو سانس لی تو گرہ دل کی کھل گئی

وارفتگی کی سینۂ مشرق میں ہے امنگ
ہر چیز میں حیات کی پیدا ہے اک ترنگ

گردوں کی آب و تاب سے ہوتی ہے عقل دنگ
ہلکا سا ابر، ابر میں یہ چمپئی سا رنگ

جامِ زمردیں میں ہیں موجیں شراب کی
شبنم میں چھپ رہی ہے کرن آفتاب کی

دولھا بنے ہوئے ہیں شگوفوں سے بوستاں
کندن بنی ہوئی ہیں پہاڑوں کی چوٹیاں

تاروں کا بزمِ چرخ پہ باقی نہیں نشاں
آنکھیں ہیں بند، ساکت و صامت ہے آسماں

ہاتھوں پہ آفتابِ درخشاں لئے ہوئے
حسنِ ازل کا دل میں تصوّر کئے ہوئے

رقصاں ہے بجسہ انجمنِ آفتاب میں
جس طرح روحِ سکر ہو موجِ شراب میں

لہریں ہیں یا ہے زلفِ دوتا پیچ و تاب میں
غلطاں ہے روح، بادِ صبا کی حباب میں

موجیں رواں ہوئی ہیں کچھ اس سوز و ساز سے
جس طرح کوئی چونک پڑے خوابِ ناز سے

شمعیں بجھاتی آئی ہیں ٹھنڈی ہوا کی رَو
پروانے سرنگوں ہیں دھواں دے رہی ہے لو

یہ وادیوں میں پھیل رہی ہے سحر کی ضَو
یا آ رہی ہے سر کو جھکائے عروسِ نَو

آنکھوں میں دلِ فریب تبسم لئے ہوئے
کاکل ہے چشمِ سرخ پہ سایہ کئے ہوئے

اے ہوش! دیکھ غور سے یہ رقصِ رنگ و بُو
تھی کب سے تجھ کو پرتوِ جاناں کی آرزو

ہاں دیکھ! یہ تبسمِ گل، نازِ آبِ جُو
کُوکُو کی یہ صدائے دل افروز کوبکو

آنکھیں اٹھا، علاجِ دلِ دردمند کر
پیہم صدائیں صلِّ علیٰ کی بلند کر

یہ صحنِ گلستاں میں ہری دوب کی ادا
یہ وادیوں کی اوس میں ڈوبی ہوئی ہوا

یہ کوئلوں کی کوک، پپیہے کی یہ صدا
رُخسارِ گُل پہ رنگ، یہ ہلکا سا دھوپ کا

رنگینیاں یہ سلسلۂ کوہسار کی
یہ تنگ گھاٹیوں میں صدا آبشار کی

یہ آب و تابِ چادرِ آبِ رواں، یہ نُور
نزہت کا یہ ہجوم لطافت کا یہ وفور

یہ دامنِ نسیم میں سرمایۂ سرور
بکھرے ہوئے زمین پہ موتی یہ دُور دُور

یہ جھلکیاں سی پردۂ ظلمت میں نُور کی
یہ معرفت میں غرق، صدائیں طیور کی

کچھ کہہ کے نجمِ صبح سے ہوا الوداع ماہ
یہ کنج کی نسیمِ خنک، یہ ہری گیاہ

یہ نہر کی تڑپ کہ ٹھہرتی نہیں نگاہ
یہ پنکھڑی کا ناز، کہ اللہ کی پناہ

صحنِ زمیں پہ شب کی سیاہی لئے ہوئے
یہ آسمان، افسرِ شاہی لئے ہوئے

کندن سے یہ کلس یہ دل آویز کوہسار
یہ دل کشا چمن، یہ فرح بخش لالہ زار

شاخوں کا دلبری سے لچکنا یہ بار بار
یہ مہر کا جمال، نہ پنہاں، نہ آشکار

یہ آسمان،
اے شیخ! تو نہیں
نظرت بھی تیری طرح

۱۹۲۶ء

اب بھی فکر دن
صبح، کبھی نیند

یہ آسماں، جلوہ گری پر تلا ہوا — یہ حسنِ لازوال کا پرچم کھلا ہوا
اے شیخ! تو نہیں ہے حقائق سے بہرہ یاب — فطرت پرست جوشؔ پر اور اس قدر عتاب
فطرت بھی تیری طرح سے ہے صاحبِ کتاب — اس دین کا صحیفۂ زرّیں ہے آفتاب

خاشاک کہہ رہا ہے جسے تو، وہ پھول ہے
ناداں! صباحِ غنچہ کشا بھی رسولؐ ہے

۱۹۲۶ء

شعلہ و شبنم

صبوحی

اٹھ بربط و صراحی و مینا لئے ہوئے — رنگِ طلوعِ صبح ہے صہبا لئے ہوئے
ہر خار و خس ہے آئینہ دارِ عروسِ گل — ہر برگِ گل ہے عارضِ سلمیٰ لئے ہوئے
غنچے ہیں رنگِ نرگسِ خوباں سے بہرہ یاب — جھونکے ہیں بوئے کاکلِ زیبا لئے ہوئے
شبنم کا رس نسیم کی خنکی کلی کا رنگ — آئے ہیں طائرانِ دل آرا لئے ہوئے
کہتے ہیں حسن کو رُوئے صنم کی ملاحتیں — وہ نشے ہے اپنی چھاؤں میں صحرا لئے ہوئے
رسوائیوں کا خوف ہے کیفِ شبینہ کو — انگڑائیوں کا جوش ہے دریا لئے ہوئے
پھولوں کے دل ہیں شرحِ محبت سے چاک چاک — کلیوں کے لب ہیں حرفِ تمنّا لئے ہوئے
شبنم ہے برگِ تازہ پہ شبنم میں سرخیاں — آہو ستاں ہیں دیدۂ موسیٰ لئے ہوئے

اے چشمِ جوشؔ! مژدہ، کہ لیلائے رنگ و بو
چٹکی میں ہے نقاب کا گوشہ لئے ہوئے

اب بھی فکروں سے اگر دم بھر کو پاتا ہوں نجات — ناتواں دل میں کھٹک جاتی ہے یوں یادِ بہار
صبح، کچی نیند سے جس طرح چونک اٹھنے کے بعد — کمسنی کی بھولی سی آنکھوں میں چبھتا ہے خمار

لُو کی آمد آمد

طے صبح کی راہ کر چکی ہے ۔۔۔ دیواروں سے دھوپ اتر چکی ہے
خنکی کی الٹ چکی ہے مسند ۔۔۔ میداں میں ہے لُو کی آمد آمد
آتی ہیں ہوائیں سنسناتی! ۔۔۔ پودوں کی دھڑک رہی ہے چھاتی
دوزخ میں بہشت ہے غزلخواں ۔۔۔ شاخوں پہ چہک رہی ہیں چڑیاں
چوپائے ابھی سے ہانپتے ہیں ۔۔۔ ہیبت سے درخت کانپتے ہیں
ہر سو ہیں رواں دواں ہوائیں ۔۔۔ لرزاں ہیں طیور کی صدائیں
تھم تھم کے نکل رہے ہیں شعلے ۔۔۔ انبار سے خشک پتیوں کے
تیزی سے ہوائیں آ رہی ہیں ۔۔۔ سن سن کی صدائیں آ رہی ہیں
یوں گرد و غبار چھا رہا ہے ۔۔۔ میداں کے حواس اڑا رہا ہے
ہلکی سی فلک پہ کچھ گھٹا ہے ۔۔۔ خورشید، ذرا سا چھپ گیا ہے
میداں بدل رہا ہے کیا روپ ۔۔۔ سایہ تھا ابھی، ابھی کڑی دھوپ
پر ہول ہوا کے ارغنوں ہیں ۔۔۔ آموں کے درخت سرنگوں ہیں
گھبرائے ہوئے ہیں باغ والے ۔۔۔ ہو جائیں کہیں نہ خشک تھالے
پھرتے ہیں اِدھر اُدھر کھلے سر ۔۔۔ کاندھوں پہ کھڑے، نظر فلک پر
سوکھی ہوئی گھانس ہے فسردہ ۔۔۔ فسردہ نہ کہیے بلکہ، مردہ
دوزخ کی نظر ہے، بزم جاں پر ۔۔۔ وحشت ہے زمین و آسماں پر
پہلوئے زمیں بدل رہی ہے ۔۔۔ ذرّوں سے دھنک نکل رہی ہے
گرمی کی ہے باڑھ پر جوانی ۔۔۔ ہر ذرّہ پکارتا ہے "پانی"

۱۹۲۰ء
جنگلوں کے سرد گو
بزم وحشت میں، تمد
فطرتِ خاموش میں
الاماں دنیا تے نادانی
متصل جھنکار سے
پھول گھبراتے ہو
ایک اسٹیشن، فسرد
ملگجے نالے، اندھیر
قدِ آدم گھانس، گھر
کاش جا کر بابوؤں
پائی تھی کس شہر میں
کس جگہ طالع ہوئی
رات دن رہتا تھا
سچ کہو، اٹھتے ہیں ج
شب کو ہوتا ہے

شعلہ و شبنم ۱۹۳۰ء

بدلی کا چاند

خورشید، وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب، وہ ہلکے بادل سے، چاندی کے ورق برسانے لگا
وہ سانولے پن پر میداں کے، ہلکی سی صباحت دوڑ چلی
تھوڑا سا ابھر کر بادل سے، وہ چاند جبیں جھلکانے لگا
لو، ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے
لو، پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرانے لگا
بادل میں چھپا، تو کھول دئیے، بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا، تو گردوں، دریا کی طرح لہرانے لگا
سمٹی جو گھٹا، تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا، تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا
غرفوں سے جھانکا گردوں کے، امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے، کہسار کا سر چکرانے لگا
پردہ جو اٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا
ابھرا تو تجلی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
الجھا، تو سیاہی دوڑا دی، سلجھا تو ضیا برسانے لگا
کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے، کیا قید ہے، کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

ساون کے مہینے

فردوس بناتے مرے ساون کے مہینے — اِک گل رخ و نسریں بدن و سرو سہی نے
ماتھے پہ اِدھر کاکلِ ژولیدہ کی لہریں — گردوں پہ اُدھر ابرِ خراماں کے سفینے
مینہ جتنا برستا تھا سرِ دامنِ کہسار — اتنے ہی زمیں اپنے اُگلتی تھی دفینے
اللہ رے یہ فرمان کہ اس مست ہوا میں — ہم منہ سے نہ بولیں گے اگر پی کسی نے
وہ مونس و غم خوار تھا جس کیلئے برسوں — مانگی تھیں دعائیں مرے آغوش تہی نے
گل ریز تھے ساحل کے لچکتے ہوئے پودے — گلرنگ تھے تالاب کے ترشے ہوئے زینے
بارش تھی لگاتار تو یوں گرد تھی مفقود — جس طرح مئے ناب سے دُھل جاتے ہیں کینے
دم بھر کو بھی تھمتی نہیں اگر سرد ہوائیں — آتے تھے جوانی کو پسینے پہ پسینے
بھری تھی چٹانوں میں بھی غنچوں کی سی نرمی — اک فتنۂ کونین کی نازک بدنی نے
گیتی سے ابلتے تھے تمنا کے سلیقے — گردوں سے برستے تھے محبت کے قرینے
کیا دل کی تمناؤں کو مربوط کیا تھا — سبزے پہ مچلتی ہوئی ساون کی جھڑی نے
بدلی تھی فلک پر کہ جنوں خیز جوانی — بوندیں تھیں زمیں پر کہ انگوٹھی کے نگینے
شاخوں پہ پرندے تھے، جھٹکتے ہوئے شہپر — لہروں میں بطیں اپنے ابھارے ہوئے سینے
اس فصل میں اس درجہ رہا بیخود و سرشار — مے خانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے

کیا لمحۂ فانی تھا کہ مُڑ کر بھی نہ دیکھا
دی کتنی ہی آواز حیاتِ ابدی نے

تیری آمد دشت میں اے شام آفت خیز ہے — تیرے سناٹے میں اک تسکین غم آمیز ہے
ذرہ ذرہ سے نمایاں ہے تمنائے سکوں — پتہ پتہ تشنگیٔ خواب سے لبریز ہے

ذی حیات مناظر

خامشی دشت پہ جس وقت کہ چھا جاتی ہے — عمر بھر جو نہ سنی ہو وہ صدا آتی ہے
بھینی بھینی سی مچلتی ہے فضا میں خوشبو — ٹھنڈی ٹھنڈی لبِ ساحل سے ہوا آتی ہے
دشتِ خاموش کی اجڑی ہوئی راہوں سے مجھے — جادہ پیماؤں کے قدموں کی صدا آتی ہے
پاس آ کر مرے گاتی ہے کوئی زہرہ جمال — اور گاتی ہوئی پھر دور نکل جاتی ہے
آنکھ اٹھاتا ہوں تو خوش چشم نظر آتے ہیں — سانس لیتا ہوں تو احباب کی بو آتی ہے
دشنہ رکھ دیتا ہے گھبرا کے رگِ جاں پہ کوئی — جب کلی خاک پہ دم توڑ کے گر جاتی ہے
مسکراتی ہے جو رہ رہ کے گھٹا میں بجلی — آنکھ سی کوہ و بیاباں کی جھپک جاتی ہے
کرنے لگتے ہیں نظارے سے جو بادل مایوس — برق آہستہ سے کچھ کان میں کہہ جاتی ہے
جھاڑیوں کو جو ہلاتے ہیں ہوا کے جھونکے — دلِ شبنم کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
مجھ سے کرتے ہیں گھنے باغ کے سائے باتیں — ایسی باتیں کہ مری جان پہ بن جاتی ہے
گنگناتے ہوئے میدان کے سناٹے میں — آپ ہی آپ طبیعت مری بھر آتی ہے
یوں نباتات کو چھوتی ہوئی آتی ہے ہوا — دل میں ہر سانس سے اک پھانس سی چبھ جاتی ہے
جب ہری دوب کے مرجھاتے ہیں نازک ریشے — شیشۂ قلب میں اک ٹھیس سی لگ جاتی ہے
بانسری جیسے بجاتا ہو کہیں دور کوئی — یوں دبے پاؤں بیاباں سے ہوا آتی ہے
حسرتیں خاک کی غنچوں سے ابل پڑتی ہیں — روحِ میدان کی پھولوں سے نکل آتی ہے
طبعِ شاعر کو، روانی کا اشارہ کر کے — نہر شاخوں کے گھنے سائے میں سو جاتی ہے

ان مناظر کو میں بے جان سمجھ لوں کیوں کر؟
جوش! کچھ عقل میں یہ بات نہیں آتی ہے